AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ڈاکٹر جاوید اقبال بہ حیثیت آپ بیتی نگار

Dr. Javed Iqbal as an Autobiographer

معین الدین آزاد

پی ایچ ڈی اسکالر (اردو)، ادارہ زبان و ادبیاتِ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر

ادارہ زبان و ادبیاتِ اُردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Abstract

This paper evaluates Dr. Javed Iqbal's autobiography, *Apna Gareban Chak*, within the broader context of Urdu autobiographical literature. While autobiographies often struggle with personal bias, a successful memoir serves as both a literary masterpiece and an authentic historical document. Tracing the development of Urdu self-narratives from early accounts to 20th-century classics, this study examines how Dr. Javed Iqbal's work stands out for its bold candor, lucid prose, and rich character portraiture (*khaka nigari*). *Apna Gareban Chak* offers a rare, humanized depiction of his father, Allama Muhammad Iqbal, demystifying his personal life and domestic realities. Furthermore, drawing on his career as a jurist and senator, Dr. Iqbal provides critical insights into Pakistan's political evolution, judicial struggles, and key historical shifts. Ultimately, the autobiography is a seminal text bridging personal reflection, Iqbalian thought, and national history.

Keywords:

Urdu Autobiography, Dr. Javed Iqbal, Apna Gareban Chak, Allama Iqbal, Pakistan Political & Judicial History.

اپنی زندگی کے حالات خود بیان کرنا آپ بیتی یا خود نوشت سوانح کہلاتا ہے۔ آپ بیتی عام طور پر زندگی کے اختتامی حصے میں تحریر کی جاتی ہے، جب مصنف کے پاس تجربات اور مشاہدات کا وافر مواد موجود ہوتا ہے جسے وہ اپنی یادداشت کی بنیاد پر دوسروں تک منتقل کرنا چاہتا ہے تاکہ لوگ اس کی زندگی کے فراز و نشیب سے استفادہ کر سکیں۔

آپ بیتی کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ سچائی کا مرقع ہو، لیکن عملاً ایسا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے؛ کیونکہ انسان بسا اوقات اپنے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے اور کئی مرتبہ پورا سچ بیان کرنے سے ہچکچاتا بھی ہے۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں؛ انسانی زندگی حجابات، تعصبات اور مصلحتوں سے گھری ہوتی ہے اور یہی حد بندیاں خود نوشت کے باب میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ مصنف کے خارجی حالات سے اس کی زندگی کی حقیقتوں کا سراغ مل جاتا ہے، اور یہی امر اسے اپنے حالاتِ زندگی درستی اور معقولیت کے ساتھ بیان کرنے کی طرف راغب کرتا ہے۔ انسانی فطرت میں نسیان (بھول چوک) شامل

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

ہے، لہٰذا کسی آپ بیتی کو پرکھتے وقت اس عنصر کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے۔ ذاتی حالات اور دلچسپ واقعات کے ساتھ ساتھ خود نوشت اس لیے بھی افادیت رکھتی ہے کہ اس میں ایک پورے عہد کی تاریخ ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ بلکہ بعض حوالوں سے خود نوشت میں بیان کردہ تاریخ روایتی مورخ کی لکھی ہوئی تاریخ سے زیادہ مستند اور زندہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے صرف ادبی ذوق کے لیے ہی نہیں بلکہ تاریخی آگاہی کے لیے بھی پڑھا جاتا ہے۔

آپ بیتی کے باب میں سچ کو بے کم وکاست بیان کرنا نہایت کٹھن کام ہے، کیونکہ سچ بولنے کا دعویٰ اور سچ سہنے کی ہمت کم لوگوں میں ہوتی ہے۔ یہی اصول آپ بیتی کے فن کو دقیق اور مشکل بنا دیتا ہے۔ آپ بیتی کے فن کے حوالے سے ممتاز نقاد **ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا** لکھتے ہیں:

"بعض لحاظ سے خود نوشت لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ سچ بولنے کا دعویٰ تو سب کرتے ہیں لیکن اس پر عمل کرنا آسان نہیں۔ انسان بسا اوقات اپنے گرد کام کرنے والوں کو بوجوہ مروت یا تعصب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ بعض واقعات کو خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتنی رکھنا پڑتا ہے۔ بعض واقعات درست بھی ہوں تو ان کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ بہت سے لکھنے والے تعصبات کو صداقت اور عدم توازن کو توازن سمجھ کر لکھ ڈالتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ صداقت کی ذیل میں شمار نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی ہے کہ انسان اپنے غلط کاموں کو بھی صحیح سمجھتا ہے اور ان کا جواز مہیا کرتا ہے، اس لیے خود نوشت کا مصنف اپنے بارے میں بہت سی غلط باتیں لکھ ڈالتا ہے لیکن یا تو انھیں درست سمجھتا ہے اور خود فریبی میں مبتلا رہتا ہے یا عمداً غلط بیانی کرتا ہے اس لیے آپ بیتی لکھنے والے سے یہ توقع بجا نہیں کہ وہ بہر حال کم وکاست واقعات، مشاہدات اور افراد کی تصویر کشی کرے، اس لیے اگر خود نوشت سچائی کے عمومی معیار پر پوری اترتی ہو اور خارجی شواہد اس کی تردید نہ کرتے ہوں اور انداز تحریر ادبیت کا حامل ہو تو ایسی خود نوشت کو کامیاب سمجھنا چاہیے۔"[1]

دنیا کی تمام زبانوں میں آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں اور کم و بیش تمام زبانوں کی آپ بیتیوں میں کسی نہ کسی حد تک تصنع یا خود داری کا عنصر پایا جاتا ہے، کیونکہ انسانی مزاج بنیادی طور پر یکساں ہے۔ اردو زبان میں بھی یہ صنف اس اثر سے بالکل پاک نہیں رہ سکی۔ اردو میں آپ بیتی کے ابتدائی نمونے روزناموں کی شکل میں ملتے ہیں، جس کی ایک اہم تاریخی مثال "تزکِ بابری" ہے۔

اردو آپ بیتیوں میں جعفر تھانیسری کی تصنیف "تواریخ عجیب" (کالا پانی) کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، جبکہ اردو شعرا میں خود نوشت سوانح لکھنے کا سہرا میر تقی میر کے سر ہے، جنہوں نے اپنی آپ بیتی "ذکرِ میر" کے نام سے فارسی زبان میں قلمبند کی۔ انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں آپ بیتی کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ اس عہد میں اردو نثر فورٹ ولیم کالج اور سر سید کی تحریک کے زیر اثر اپنے ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی، لیکن اردو ادب میں اس کی شاہکار مثالیں بیسویں صدی میں سامنے آئیں۔

اب تک اردو زبان میں سینکڑوں آپ بیتیاں تحریر کی جا چکی ہیں۔ جعفر تھانیسری کے بعد عبد الغفور نساخ نے اپنی خود نوشت لکھی (جو ان کی وفات کے سو سال بعد شائع ہوئی)۔ ۱۹۱۰ء میں ظہیر دہلوی کی "داستانِ غدر" اور ۱۹۱۹ء میں خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی منظرِ عام پر آئی۔ جوش ملیح آبادی کی "یادوں کی بارات" نے اردو سوانح نگاری کو ایک نیا موڑ دیا، جس کے بعد ممتاز مفتی نے "علی پور کا ایلی" اور "الکھ نگری" کے ذریعہ صاف گوئی کی نئی روایت قائم کی۔

دیگر اہم آپ بیتیوں میں احسان دانش کی "جہانِ دانش"، میرزا ادیب کی "مٹی کا دیا"، اختر الایمان کی "اس آباد خرابے میں"، ڈاکٹر وزیر آغا کی "شام کی منڈیر سے" اور انتظار حسین کی "چراغوں کا دھواں" نمایاں ہیں۔ قدرت اللہ شہاب نے "شہاب نامہ" لکھ کر تاریخ اور سوانح کا گراں قدر مرقع پیش کیا، جبکہ قرۃ العین حیدر نے "کارِ جہاں دراز ہے" کے نام سے سوانحی ناول تحریر کیا۔ بیسویں صدی کے آخری چار عشروں میں بڑی تعداد میں آپ بیتیاں لکھی گئیں۔ کسی بھی آپ بیتی کی کامیابی کے لیے آپ بیتی نگار کی شخصیت اور اس کے تجربات کا پھیلاؤ اہم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا رقم طراز ہیں:

"آپ بیتی لکھنے والے کو اگر بہت اہم نہیں تو کم از کم ایک حد تک جانی پہچانی شخصیت ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کی زندگی اہم واقعات کی حامل ہو جبھی آپ بیتی لکھنے کا جواز مہیا ہو سکتا ہے۔ معمول کے مطابق زندگی کے ماہ و سال بسر کر کے رخصت ہونے والوں کو اس صنف سے روگردانی ہی مناسب ہو گی۔"[۲]

اپنا گریباں چاک

اکیسویں صدی کے آغاز میں بھی کچھ آپ بیتیاں منصہ شہود پر آئیں لیکن ان سب سے زیادہ مشہور آپ بیتی ڈاکٹر جاوید اقبال کی ہے۔ اپنا گریباں چاک ۲۰۰۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس آپ بیتی میں پیش لفظ کے ساتھ چودہ ابواب شامل تھے۔

اس آپ بیتی کی اشاعت کے ساتھ ہی ڈاکٹر جاوید اقبال پر تحسین اور تنقید کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد سامنے آئی۔ یہ سب کچھ جاوید اقبال کی صاف گوئی اور بعض مقامات پر ان کے علامہ اقبال سے فکری اختلافات کی وجہ سے تھا۔ حالاں کہ علمی حیثیت سے ایک بیٹے کا اپنے والد سے اختلاف کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں لیکن ہمارے ہاں بعض اقبال شناسوں نے اقبال کی عقیدت میں اس بات کو برا گردانا اور ڈاکٹر جاوید اقبال پر بے پناہ تنقید کی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس تنقید کا جواب نہیں دیا کیوں کہ وہ اپنی صاف گوئی کا اظہار اپنی آپ بیتی اپنا گریباں چاک میں کھل کر چکے تھے۔ اس کتاب کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن ان کی وفات سے چند ماہ قبل ۲۰۱۵ء میں سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں آٹھ نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال کو ہمیشہ فرزند اقبال کے طور پہ جاننے کی کوشش کی گئی جس کا شکوہ انھوں نے اپنی اس خودنوشت سوانح میں بھی کیا ہے۔ لیکن چوں کہ انھوں نے بطور طالبِ علم، وکیل، جج اور ادیب ایک بھرپور زندگی گزاری تھی، اس لیے ان کی آپ بیتی میں وہ تمام دلچسپیاں موجود ہیں جو بطور صنف اس میں ہونی چاہیے تھیں۔ ان کی یہ آپ بیتی ایک عمدہ کاوش ہے۔ جس میں تمام تر واقعات ان کی ذات، فکر اقبال اور پاکستان کی سیاسی اور علمی و ادبی تاریخ کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک کامیاب آپ بیتی کے معیار پر پورا اُترتی ہے۔ دوسری طرف زبان و بیان کی چند قابلِ گرفت غلطیوں سے قطع نظر اس کا اسلوب سادہ، رواں اور عام فہم ہے۔ پھر اس میں کئی ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں جن میں عام قاری کے لیے دلچسپی کا بہت سا سامان موجود ہے۔ خصوصاً شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی نجی زندگی کے حوالے سے بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کی سیاسی اور عدالتی تاریخ کے بہت اہم واقعات اور نامور شخصیات کے کرداروں کی نقاب کشائی بھی کی گئی ہے جو عام لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رہتا ہے۔ اس میں فلسفیانہ انداز میں روایت

اور جدید کے درمیان پائی جانے والی کشمکش کا احوال بھی بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا اپنا رجحان جدیدت کی طرف ہے لیکن قاری کے لیے روایت اور جدیدت کو سمجھنے کے لیے اور اس پر غور کرنے کے لیے مواد بھی موجود ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت اپنا گریباں چاک اُردو ادب کی اہم آپ بیتیوں میں شمار کی جاتی ہے۔

اس آپ بیتی میں سب سے زیادہ جس صنف کا رنگ موجود ہے، وہ خاکہ نگاری ہے۔ جاوید اقبال نے اپنی اس آپ بیتی میں جن نامور شخصیات کے خاکے کھینچے ہیں، ان میں سرفہرست ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، جنرل ایوب خان، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاالحق وغیرہ ہیں۔ ان اشخاص کا ذکر کرتے ہوئے، مصنف نے لاشعوری طور پر خاکے کا رنگ بھر دیا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ بھرپور خاکہ علامہ محمد اقبال کا ہے جس میں ان کی زندگی کے ایسے گوشے دکھائی دیے جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ اپنے والد اور والدہ کا ذکر کرتے ہوئے ، انھوں نے صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ انھیں خاندانی حالات بتاتے ہوئے کوئی عار محسوس نہیں ہوئی کہ ان کے والدین کا تعلق نچلے متوسط درجے کے گھرانوں سے تھا یا کہ ان کے ماموں مال روڈ کے کسی قالین فروش کی دکان پر ملازم تھے۔ اپنی والدہ کے خاندان کے بارے میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”معاشرتی طور پر میرے ماں باپ کے خاندانوں کا تعلق نچلے درمیانی طبقہ سے تھا۔ میرے والد کے خاندان کے مقابلے میں میری والدہ کا خاندان کم افراد پر مشتمل اور معاشی اعتبار سے زیادہ کمزور تھا۔ میری والدہ کے صرف ایک ہی بھائی تھے، خواجہ عبدالغنی، جو مجھ سے اور منیرہ سے بے حد پیار کرتے تھے۔ دونوں بہن بھائی بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے اور انھیں ان کی پھوپھی اور پھوپھا نے پالا تھا جن کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ پھوپھا ہائیکورٹ میں عرضی نویس تھے اور موچی دروازے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ میرے ہوش سنبھالنے پر وہ فوت ہو چکے تھے۔ البتہ پھوپی بقیدِ حیات تھیں، جنھیں میں نانی جی کہتا تھا۔ ماموں عبدالغنی ایک کشمیری قالین فروش عنایت اللہ کی مال روڈ پر دکان میں ملازم تھے۔ گرمیوں میں تین ماہ کے لیے دکان مسوری میں لگتی تھی۔ اس لیے وہ صرف سردیوں کے مہینے میں لاہور میں گزارتے تھے۔"[۳]

اسی طرح انھوں نے اپنے والد کے خاندان کے بارے میں کافی تفصیل سے بتایا ہے۔ اپنے تایا شیخ عطا محمد اور ان کی اولاد کے بارے میں، ان کے ایک بیٹے جو پڑھے لکھے تھے لیکن قادیانی تھے، یہ چیز اقبال کو پسند نہ تھی۔ اس کے علاوہ دوسرے بیٹے جو موٹر مکینک اور تیسرے بیٹے سول سیکرٹریٹ میں کلرک تھے۔ پھر ان کی اولاد کا تذکرہ بھی شامل کیا ہے۔ اپنے والد کے خاندان کے بارے میں بیان کرنے کے بعد مصنف لکھتے ہیں:

> ”اس تفصیل سے واضح ہے کہ میرے والد کا خاندان بھی میری والدہ کے خاندان کی طرح نچلے درمیانی طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس خاندان میں صرف ایک ہی نابغہ عصر اور یگانہ روزگار شخص اتفاقاً یا ناگہانی یا حادثاتی طور پر پیدا ہوا۔“[۴]

آپ بیتی کے آغاز ہی میں اپنی تاریخ پیدائش مع وقت بتاتے ہوئے اس وجہ یہ بتائی کہ اقبال نے ان کی تاریخ پیدائش پوری تفصیل

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

کے ساتھ اپنے ایک ہندو دوست راجہ سریندر ناتھ کو مہیا کی تھی تا کہ وہ جاوید اقبال کی جنم پتری بنوا سکیں۔ یہ چیز پڑھنے والے کو فوراً اقبال کی ضعیف الاعتقادی کی طرف متوجہ کرتی ہے جو یقیناً ایک چونکا دینے والی چیز ہے لیکن آگے چل کر مصنف خود اپنے والد کے اس عمل کے بارے میں بیان کرتے ہیں، وہ اقبال کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو سامنے لائے ہیں جس میں وہ ایک عام سے باپ نظر آتے ہیں۔ جاوید اقبال نے اپنے والد کے اس عمل کے بارے میں تین اندازے لگائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے دوست راجہ سریندر ناتھ کو خوش کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ان کا یہ بیٹا بھی تو کہیں پہلی بیوی معراج بیگم سے ہونے والے بیٹے آفتاب اقبال کی طرح نافرمان اور سرکش تو نہیں نکلے گا۔ تیسرا یہ کہ ان کا یہ بیٹا اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں کوئی کردار ادا کرے گا یا نہیں۔ تیسری وجہ بتاتے ہوئے انھوں نے اپنے والد کے تصوف کے میلان کو بھی نمایاں کیا ہے۔ خصوصاً سلسلہ نقشبندیہ کے مشہور بزرگ شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ سے ان کی عقیدت کا بیان واضح کرتا ہے کہ اقبال تصوف کے کس قدر قائل تھے۔ علامہ محمد اقبال کا ان کے مزار پر جا کر یہ دعا کرنا کہ اگر اللہ انھیں اولادِ نرینہ سے نوازے گا تو وہ اسے لے کر یہاں حاضر ہوں گے۔ اسی لیے وہ جب دس برس کے ہوئے تو ان کے والد انھیں لے کر شیخ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ جاوید اقبال اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ”چناں چہ جب میں تقریباً دس برس کا ہوا (۲۹ جون ۱۹۳۴ء) تو مجھے ہمراہ لے کر سرہند شیخ احمدؒ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں ان کی انگلی پکڑے مزار میں داخل ہوا۔ گنبد کے تیرہ و تار ماحول نے مجھ پر ایک ہیبت سی طاری کر دی تھی۔ میرے والد تربت کے قریب فرش پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے پاس بٹھا لیا۔ پھر انھوں نے قرآن مجید کا ایک پارہ کھولا اور دیر تک تلاوت کرتے رہے۔ اس وقت وہاں اور کوئی موجود نہ تھا۔ گنبد کی تاریک فضا میں ان کی رندھی ہوئی مدہم آواز گونج رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو امڈ کر رخساروں پر ڈھلک آئے ہیں۔“[۵]

اقبال کی ازدواجی زندگی کا حال بیان کرتے ہوئے انھوں نے جو چند مناظر بیان کیے ہیں، اس میں اقبال ایک عام سے شوہر کی طرح اپنی بیوی کی باتیں سنتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے ماں باپ کے درمیان تکرار کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ان کی والدہ علامہ اقبال سے جھگڑ رہی تھیں کہ وہ باقاعدگی سے وکالت کریں تا کہ گھر کے خرچے پورے کیے جا سکیں اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے یہ طعنہ دیا کہ وہ ہر وقت بستر پر دراز شعر کہتے رہتے ہیں۔ یہ منظر قریب قریب ہر متوسط گھر میں کسی نہ شکل میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنے والد کی کمزور دلی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ نقل کیا جس میں گرنے کی وجہ سے ان کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون نکل آیا تھا، خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اقبال اسی وقت زنان خانے میں داخل ہوئے اور اچانک اپنے بیٹے کے منہ سے خون نکلتے دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔

اقبال کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ان کی مشہور نظم ”جاوید کے نام“ کا پس منظر بھی بیان کیا ہے کہ جب ان کے والد گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے تھے تو انھوں نے والد کو خط لکھا جس میں وہاں سے گراموفون لانے کی فرمائش کی گئی تھی۔ جس کے جواب میں اقبال نے اپنی شہرہ آفاق نظم ”جاوید کے نام“ لکھی جسے بہت زیادہ مقبولیت اور پذیرائی ملی۔

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر　　　　　　نیا زمانہ، نئے صبح و شام پیدا کر

اپنے والد کی شفقت اور محبت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان کی محبت میں اظہار کا شدید فقدان پایا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کبھی جاوید کو پیار سے بھینچا، گلے لگایا یا چوما نہیں تھا۔ جس سے ان کو یوں لگتا تھا کہ وہ اس سے پیار نہیں کرتے لیکن پھر خود ہی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انھیں مجھ سے محبت نہ تھی، سراسر غلط ہے۔ ان کی محبت کے اظہار میں ایک اپنی طرز کی خاموشی تھی جس میں غیر ضروری ہیجان کا فقدان تھا یا اس کی نوعیت فکری یا تخیلی تھی جسے سمجھ سکنا میرے لیے مشکل تھا۔“ ۶

لیکن آگے چل کر وہ بتاتے ہیں کہ جس دن ان کی والدہ کی وفات ہوئی، اس دن پہلی بار اقبال نے ان کی پیشانی کو چوما اور پھر اس کے بعد وہ دونوں بہن بھائیوں کا بے حد خیال رکھنے لگے۔ اقبال اکثر جاوید کو اس بات پر ڈانٹتے تھے کہ وہ اپنی بہن کا خیال نہیں رکھتا کیوں کہ کئی مرتبہ جاوید کا منیرہ کے ساتھ جھگڑا ہو جایا کرتا تھا۔ یہ سب اقبال کی شخصیت کے ایک حساس باپ کے پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔
علامہ اقبال کے بھوپال جانے کے تذکرے میں ایک اور چیز سامنے آتی ہے کہ جب گلے کے علاج کے لیے ڈاکٹروں نے انھیں ویانا (آسٹریا) جانے کی تجویز دی تو انھوں نے صرف اس لیے رد کر دی کہ وہ اپنی ذات پر پیسہ لگا کر اپنے بچوں کی آنے والی زندگی کا حق غصب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے نواب بھوپال کی طرف سے بھوپال جا کر علاج کروانے کی پیش کش قبول کر لی۔
اقبال کے خاکے میں انھوں نے اقبال پر شعر کی آمد کا نقشہ بھی خوب کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور بھی زیادہ خراب ہو جایا کرتی تھی۔ چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا، بستر پر کروٹیں بدلتے۔ کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے۔ اکثر اوقات وہ رات کو دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو بیاض پر اشعار لکھ دیتے۔ اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے اور وہ آرام سے لیٹ جایا کرتے۔“ ۷

اقبال کی عادات اور مزاج کا ذکر کرتے ہوئے مصنف بتاتے ہیں کہ اُن کے والد میں بڑی قوتِ برداشت تھی مگر جب ایک مرتبہ کسی سے ناراض ہو جاتے تو پھر ساری عمر اس کا چہرہ دیکھنے کے روادار نہ ہوتے۔ اس کے علاوہ انھیں جوانی میں کبوتر بازی کا شوق بھی تھا۔ پھر انھوں نے قرآن سننے اور نبی کریم ﷺ کا تذکرہ سن کر اپنے والد کو روتے دیکھا تھا۔ ان کے ایک عقیدت مند جو عرب تھے، جب انھیں قرآن پڑھ کر سنایا کرتے تو آبدیدہ ہو جاتے اور جاوید سے کہتے: ”تمھیں یوں قرآن پڑھنا چاہیے۔“ اپنے والد کی اس آبدیدگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”میں نے انھیں والد کی موت پر آنسو بہاتے نہ دیکھا تھا مگر قرآن مجید سنتے یا اپنا کوئی شعر پڑھتے وقت یا رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک کسی کی نوکِ زبان پر آتے ہی ان کی آنکھیں بھر آیا کرتیں۔“ ۸

قائد اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس دن علامہ اقبال نے انھیں خصوصی طور پر ہدایت دی کہ ایک مہمان آنے والے ہیں، جب وہ آکر بیٹھ جائیں تو وہ ان سے آٹوگراف لینے کی استدعا کریں۔ یہیں قائد اعظم نے جاوید اقبال جو چھوٹے بچے تھے، کچھ سوالات کیے۔ اس مختصر سی ملاقات سے مصنف کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے والد قائد اعظم کی بہت عزت کرتے تھے۔ انھوں نے پنڈت جواہر لعل نہرو کی اپنے والد سے ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے۔ جب وہ اقبال سے ملنے کے لیے ان کے گھر آئے۔ جاوید اقبال اور میاں محمد شفیع نے پنڈت نہرو کا استقبال کیا، علامہ اقبال ان سے بڑے تپاک سے ملے۔ بعد میں ان کی پنڈت نہرو سے دوسری ملاقات اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔

اقبال کی آخری عمر میں دو خواہشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھیں ایک تو کشمیر جانے کی خواہش تھی لیکن چوں کہ ان کا کشمیر میں داخلہ ممنوع تھا، اس لیے انھیں اجازت نہ مل سکی۔ دوسرا انھیں حج کرنے کی آرزو تھی لیکن یہ بھی ناتمام رہی۔ اپنے والد کے دوستوں اور ان کی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے، انھوں نے کئی نامور لوگوں کے نام گنوائے ہیں۔ مثلاً سید نذیر نیازی، راجہ حسن اختر، حکیم قرشی، میاں محمد شفیع اور چوہدری محمد حسین وغیرہ۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ عبدالمجید سالک کا نام بھول گئے ہیں جو اقبال کے بہت قریبی دوست اور نیاز مند تھے۔

> "اقبال کی وفات کی رات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس رات جاوید منزل میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ جاوید نو بجے کے قریب کمرے میں داخل ہوئے تو پہچان نہ سکے، پوچھا کون؟ جواب دیا: جاوید، ہنس پڑے اور بولے:" جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔""[۹]

یہیں انھوں نے اپنے قریبی دوست چوہدری محمد حسین کو تاکید کی کہ وہ جاوید کو جاوید نامہ کے آخر میں موجود دعا "خطاب بہ جاوید" ضرور پڑھا دیجیے گا۔ پھر احباب کا بکھرا ہوا مجمع دیکھ کر اقبال کو اندازہ ہو گیا تھا کہ آج کی رات مشکل کٹے گی لیکن بقول جاوید وہ بہت ہشاش نظر آتے تھے۔

قریباً طلوع آفتاب کے وقت علی بخش کے کہنے پر وہ اپنی بہن منیرہ کے ساتھ اپنے والد کے کمرے کی طرف گئے تو انھوں نے اقبال کو آخری بار جس حالت میں دیکھا، اس کیفیت کو وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> "میں نے دہلیز پر کھڑے کھڑے اندر جھانکا۔ ان کے کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ کھڑکیاں کھلی تھیں اور وہ چارپائی پر سیدھے لیٹے تھے۔ انھیں گردن تک سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا جو کبھی کبھار ہوا کے جھونکوں سے ہل جاتی۔ والد کی آنکھیں بند تھیں، چہرہ قبلہ کی جانب تھا، مونچھوں کے بال سفید ہو چکے تھے اور سر کے بالوں کے کناروں پر میرے کہنے سے آخری بار لگائے ہوئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی موجود تھی۔""[۱۰]

پھر اقبال کے دفنانے کے لیے جگہ کے مسئلے کا ذکر ہے کہ اس سلسلے میں تین مقامات زیرِ غور تھے۔ اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ، نیلا گنبد کی مسجد اور میڈیکل کالج کے درمیان قطعہ اراضی اور بادشاہی مسجد کی بائیں دیوار کے ساتھ۔ چوہدری محمد حسین کی تجویز پر سب نے بادشاہی مسجد کے دیوار کے ساتھ والی جگہ پر اتفاق کیا۔ اس تجویز کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات نے تو قبول نہ کیا لیکن انگریز

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

گورنر سرہنری کریک نے اجازت دے دی۔یوں اقبال مسجد کے زیر سایہ دفنائے گئے جو ان کے اپنی خواہش بھی تھی۔

جاوید اقبال نے اس آپ بیتی میں اپنے والد علامہ محمد اقبال کی شخصیت کا بہت عمدگی سے احاطہ کیا ہے اور ان کے اس خاکے سے گوشہ اقبال کے وہ پہلو سامنے آتے ہیں جو عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔وہیں انھوں نے اپنی والدہ کا ذکر جن الفاظ میں کیا ہے، وہ بھی ایک خاکے کا رنگ اختیار کر گیا ہے۔انھوں نے اپنی والدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا نام سردار بیگم تھا۔انھوں نے ان کی تاریخ وفات 23 مئی 1935ء لکھی ہے ۔ وہ بیالیس سال کی عمر میں جاوید منزل منتقل ہونے کے تیسرے یا چوتھے روز انتقال کر گئیں تھیں۔

جاوید اقبال کی ذوالفقار علی بھٹو سے پہلی ملاقات کراچی ایئرپورٹ پر ہوئی۔جہاں بقول ان کے کہ:" بھٹو کسی مجرا پارٹی میں ساری رات بیدار رہنے کے سبب جاگو مٹی کیفیت میں آئے اور مجھے گلے سے لگا لیا۔"انھوں نے بھٹو کا ذکر ایک اور جگہ پر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نیو یارک میں ان کے قیام کے دوران سکندر مرزا اپنی بیوی کے ساتھ تشریف لائے۔وہ لاونج میں بیٹھے ہوئے تھے جب بھٹو وہاں سے گزرے مگر آنکھیں چرا کر دوسری طرف نکل گئے۔جاوید اقبال کے مطابق ان کے سننے میں آیا تھا کہ بھٹو نے بڑی کوششوں سے سکندر مرزا کی صدارت کے زمانے میں ان تک رسائی حاصل کی تھی۔اس واقعہ سے بھٹو کی خود غرضی اوران کا ابن الوقت ہونا نمایاں ہوتا ہے۔ پھر بھٹو کا ذکر کرتے ہوئے ہوئے انھوں نے ان کی سخت مزاجی بلکہ ترش روی کا ذکر بھی کیا ہے ۔ ایک دن وہ اپنے مشن کے بنگالی انفارمیشن آفیسر سے سخت ناراض تھے اور ان کی بے عزتی کر رہے تھے۔بات یہ تھی کہ بھٹو چاہتے تھے کہ ان کی تصویر نیو یارک ٹائمز کے پہلے صفحہ پر لگے مگر انفارمیشن آفیسر یہ کام نہ کر سکا تھا۔ بھٹو کے جانے کے بعد وہ بنگالی افسر پنجابیوں کے خلاف بولتا رہا۔ جس پر جاوید اقبال نے اسے توجہ دلائی کہ بھٹو پنجابی نہیں بلکہ سندھی ہیں تو اس نے جواب دیا:" ہمارے لیے تو آپ سب پنجابی ہی ہیں۔" پھر انھوں نے کسی پارٹی میں میں بھٹو کی شراب نوشی کا ذکر بھی خوب کیا ہے۔ایسی ہی ایک پارٹی کے موقع پر بھٹو نے ماڈی ڈیوس سے بد تمیزی کی۔ جس پر اس نے یہ پیغام بھجوایا کہ یہ شخص کبھی پاکستان کا وزیر اعظم بنا تو پاکستان کے امریکہ سے تعلقات ختم ہو جائیں گے۔ بھٹو امریکہ کے سخت مخالف تھے اور بعض اوقات اس کے لیڈروں کو فحش گالیاں بھی دیا کرتے تھے اور جنرل ایوب کے وزیر خزانہ شعیب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ آگے چل کر جاوید نے جنرل ایوب خان کے بارے میں بھی یہی رائے دی ہے ہے کہ وہ امریکہ کے خاص آدمی تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> " ایوب حکومت میں شعیب امریکی مفادات کا خصوصی طور پر خیال رکھتے تھے۔ علاوہ اس کے جنرل ایوب خان خود بھی امریکہ نواز ہی نہیں بلکہ امریکہ کی جیب میں تھے۔"''

بعد میں محترمہ فاطمہ جناح کے زمانے میں بھٹو اپنی جماعت پیپلز پارٹی بنانے کی فکر میں تھے۔ تو جاوید نے محترمہ فاطمہ جناح کا پیغام انھیں دیا کہ وہ مسلم لیگ کو فعال بنائیں لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ بھٹو نے جاوید اقبال کو بتایا کہ ان کی پیپلز پارٹی کا نعرہ اسلامی سوشلزم ہو گا یعنی روٹی کپڑا اور مکان اور جاوید اقبال کو ان کی پارٹی میں شامل ہو کر ملک کی خدمت کرنی چاہیے۔ جب انھوں نے سوال پوچھا کہ مسلم لیگ کا نعرہ بھی اسلام ہی ہے تو پھر اسلامی سوشلزم کا کیا مطلب۔ بھٹو نے جواب دیا:

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

"تم تو پروفیسروں جیسی باتیں کرتے ہو۔ بھائی میں نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ اس خیال سے نہیں بنایا کہ اس اصطلاح کے کوئی خاص معنی ہیں۔ سیاست میں اصطلاحیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اصل مقصد اقتدار حاصل کرنا ہوتا ہے۔ میں نے یہ نعرہ اس لیے بنایا ہے کہ مشرقی پاکستان میں جب تک سوشلزم کا نام نہ لو تو کوئی آپ کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں اسلام کا نام لیے بغیر کام نہیں بنتا۔ میرا تعلق نہ تو سوشلزم سے ہے نہ اسلام سے۔ اصل مقصد حصولِ اقتدار ہے اور بس۔"[۱۲]

انتخابات کے حوالے سے جاوید اقبال نے بھٹو کے نعرے "روٹی، کپڑا اور مکان" کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ خود جاوید جو بھٹو کے مقابلے الیکشن لڑ رہے تھے، ہار گئے۔ ووٹروں نے قیمے والے نان ادھر سے کھائے لیکن ووٹ بھٹو کو دیے۔ جب بھٹو پاکستان کے وزیر اعظم بن گئے تو اس کے زمانے میں عدلیہ کے حوالے سے جاوید بیان کرتے ہیں کہ بھٹو کا زمانہ بھٹو شاہی کہلاتا ہے یا بھٹو گردی۔ مگر اعلیٰ عدلیہ کے لیے یہ زمانہ اچھا نہ تھا۔ اسی دور میں بھٹو اور عدلیہ کے درمیان جو تناؤ شروع ہوا، وہ ان کے عبرتناک انجام پر جا کر ختم ہوا۔

سیاسی حالات یا شخصیات سے واسطہ تو جاوید کو بچپن ہی سے رہا ہے۔ انھوں نے اپنے والد کے ساتھ بچپن میں قائد اعظم اور پنڈت جواہر لعل نہرو جیسی شخصیات سے ملاقات کی تھی۔ لندن سے تعلیم مکمل کر کے واپس آنے پر انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بطور وکیل کیا۔ سیاسی لوگوں سے ان کا باقاعدہ تعلق صدر سکندر مرزا سے شروع ہوا۔ جب وہ اقبال اکادمی کی طرف سے منعقدہ یومِ اقبال کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے۔ وہاں قدرت اللہ شہاب نے صدر سکندر مرزا کی طرف سے ملنے کا پیغام دیا۔ اس ملاقات میں سکندر مرزا نے انھیں معاہدہ بغداد کے سیکرٹریٹ کے ساتھ ایڈیشنل سیکرٹری کے طور پر منسلک کر کے بھیجنا چاہا لیکن مصنف نے ملک سے باہر جانے سے انکار کر دیا اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں قائم کمیشن کے ساتھ کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا جس پر صدر سکندر مرزا نے کہا:

"یہ سن کر سکندر مرزا ہنس دیے، کہنے لگے: مگر وہ کمیشن تو آئین کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر وجود میں لایا گیا ہے۔ اسے نہ تو کوئی کام کرنا ہے، نہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ کوئی کام کرے۔ البتہ اگر تمھاری خواہش یہی ہے تو میں ابھی تمھیں اس کے ساتھ منسلک کیے۔"[۱۳]

پھر باقی گفتگو سے یہ اندازہ بھی ہوا کہ صدر سکندر مرزا ڈاکٹر جاوید اقبال کو سیاست میں لا کر اپنے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ سیاسی تاریخ کے ضمن میں انھوں نے جنرل ایوب کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین کی تیاری کے لیے میاں منظور قادر کو کہہ رکھا تھا لیکن دوسری طرف بظاہر جنرل ایوب نے جسٹس شہاب الدین سے فرمائش کر رکھی تھی کہ وہ پاکستان کے مستقبل کا آئین ترتیب دیں۔ جسٹس شہاب الدین نے بڑی محنت سے ایک صدارتی طرز کا جمہوری آئین ترتیب دیا لیکن جنرل ایوب نے میاں منظور قادر والا آئین ہی نافذ کیا۔ اس بات کا جسٹس شہاب الدین کو بڑا صدمہ ہوا جو ان کی موت پر منتج ہوا۔ یوں جاوید اقبال کے اس بیان سے ہم ایک اہم تاریخی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ پاکستان کے لیے ۱۹۶۲ء کا آئین اصل میں میاں منظور قادر نے تیار کیا تھا۔

بھٹو کے زمانے میں عدلیہ پر جو دباؤ تھا، وہ بھی بہت زیادہ تھا ان کے بقول:

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

”بھٹو کا زمانہ بھٹوشاہی کہلاتا ہے یا بھٹو گردی، مگر اعلیٰ عدلیہ کے لیے یہ زمانہ اچھا نہ تھا۔“ [۱۴]

بھٹو حکومت میں عدلیہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے کیا کیا حربے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس کی ایک مثال تو انھوں نے جسٹس ظلہٰ کے حوالے سے دی ہے۔ جنھوں نے کھر کے خلاف ایک دو فیصلے دیے تھے اور پولیس والوں کے ذریعے انھیں تنگ کیا جاتا تھا۔ دوسری طرف جسٹس سردار اقبال کو ہٹا کر جسٹس یعقوب علی خان کو چیف جسٹس آف پاکستان بنا دیا گیا۔ جاوید نے اس کی جو وجہ بیان کی ہے، وہ عدلیہ کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے:

> ”وجہ یہ تھی کہ بھٹو حکومت کے نزدیک سردار اقبال شاید بہت زیادہ انڈی پنڈنٹ جج تھے یا کسی معاملے میں ضرورت پڑنے پر اٹارنی جنرل کے ذریعے بھٹو تک پہنچنے کی بجائے ان سے براہ راست بات کرتے تھے، اس لیے ان پر اعتماد نہ کیا جاسکتا تھا کہ حکومت کی مرضی کے مطابق فیصلے دیں گے، مگر ان کے مقابلے میں جسٹس یعقوب علی خان قابلِ اعتماد چیف جسٹس آف پاکستان تھے اور حکومت ان سے جو چاہے فیصلے کرواسکتی تھی۔“ [۱۵]

آپ بیتی میں ڈاکٹر جاوید اقبال بھٹو دور اور جنرل ضیاء الحق کے مارشل پر بڑی تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔ اُس کے بعد ۱۹۹۴ء میں جاوید نے دو اہم واقعات کا ذکر کیا ہے۔ پہلا یہ کہ مارچ میں انھوں نے میاں نواز شریف کے دیے گئے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر پنجاب سے سینٹ کے انتخابات میں حصہ لیا اور ٹیکنوکریٹ کی سیٹ پر کامیاب ہوئے۔ دوسرا یہ کہ اگست میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت کے دوران ان کی بیوی ناصرہ ہائی کورٹ کی جج مقرر ہوئیں۔

جاوید اقبال میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ان سے ان کی براہ راست ملاقات نہیں تھی۔ ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں میں ان کے والد میاں محمد شریف نے ان کی بڑی مدد کی تھی۔ اس لیے وہ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ دوسرا حوالہ مجید نظامی تھے جو نواز شریف کے بہت قریبی ساتھی تھے۔ ان کے خیال میں غالباً مجید نظامی ہی کے کہنے پر پر میاں نواز شریف نے جاوید کو سینیٹ کا ٹکٹ دیا تھا۔

سینٹ کے اجلاسوں کے حوالے سے سے جاوید بیان کرتے ہیں کہ سینٹ میں زیادہ تر صرف یہی ہوتا تھا کہ اپوزیشن ہر وقت حکومت کی ٹانگ کھینچنے میں مصروف رہتی تھی اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی بھی قانون پاس نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ تھی کہ ملک زیادہ تر صدارتی فرمانوں پر چل رہا تھا اس لیے ڈاکٹر جاوید اقبال نے سینٹ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

> ”یہاں پر قانون سازی جو کہ ہمارا اصل کام ہے، وہ تو ہم کرتے نہیں، یہاں پارلیمنٹ کا سیشن ختم کر کے کے آرڈیننسز کے ذریعے قوانین بنائے جاتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسمبلیوں کی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کیے ڈبیٹنگ سوسائٹیاں ہیں۔ ان میں ہم صرف بحث کرسکتے ہیں لیکن قانون سازی کا کام یہاں نہیں ہوتا۔ اس بنا پر خدشہ ہے کہ پارلیمانی نظام یہاں کامیابی کے ساتھ نہیں چلایا جاسکتا۔“ [۱۶]

جاوید اقبال کے خیال میں ان اجلاسوں کے دوران بیٹھنا وقت کا ضیاع تھا اس لیے انھوں نے سوچا کہ بیٹھنے سے بہتر ہے کہ کچھ لکھنا پڑھنا شروع کر دیا جائے۔ اس لیے انھوں نے جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں افکارِ اقبال کے موضوع پر جو لیکچر دیے تھے، ان کے نوٹس

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

تیار کرنے شروع کر دیے۔ یہ کتاب اب بعنوان "افکار اقبال، تشریحات جاوید" کے نام سے چھپ چکی ہے۔

عدلیہ پر انتظامیہ کے دباؤ کے حوالے سے انھوں نے بہت سے واقعات نقل کیے ہیں۔

طالبان کے حوالے سے بھی ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ میاں نواز شریف نے افغانستان کی خانہ جنگی ختم کروانے کے لیے بہت کوششیں کیں۔ ان کے درمیان امن و امان قائم رکھنے کے لیے کئی طرح کے معاہدے کروائے لیکن وہ ہر وقت آپس میں لڑتے رہتے۔ تنگ آکر پاکستان نے اپنی پالیسی کو بدلا کہ صرف ایک گروپ کو مدد دی جائے۔ جس کی مختلف نسلی گروہوں میں اکثریت ہو اور یوں بالا آخر پاکستان نے طالبان کی مدد کی اور وہ باقی ماندہ گروہوں کو شکست دے کر ۹۰ فیصد افغانستان پر قابض ہو گیا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے انڈیا کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کے لاہور آنے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب واجپائی لاہور آئے تو ملک میں دو طرح کی رائے موجود تھیں ایک وہ تھی جو تنازعہ کشمیر کے پس منظر میں اسے ناپسند کر رہے تھے۔ دوسری وہ رائے تھی جو سمجھتے تھے کہ پاکستان کو انڈیا کے ساتھ اچھے تعلقات اور تجارت کو بڑھانا چاہیے۔ اس ملاقات کے نتیجے میں اعلان لاہور ہوا۔ اگرچہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں نے اس ملاقات اور اعلان لاہور کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے کارگل آپریشن سے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بقول ان کے انھیں اس کی خبر نہیں کہ یہ آپریشن کس کی ایماء پر شروع کیا گیا تھا۔ آیا اس کا حکم میاں نواز شریف نے خود دیا تھا یا جرنیلوں نے خود فیصلہ کرتے ہوئے اس ایکشن کا آغاز کیا تھا۔ ان کے مطابق مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے کارگل آپریشن کے متعلق بریفنگ بریگیڈیئر قریشی نے دی جنھوں نے مختلف نقشوں کی مدد سے انھیں سمجھایا کہ کارگل آپریشن میں کہاں کہاں قبضہ کیا جائے گا اور اس سے کیا کیا فوائد حاصل کیے جائیں گے۔ انھوں نے یہی باتیں سینٹ میں اپنی تقریر میں دہرادیں اپوزیشن نے اس آپریشن کو ناکام قرار دیا تھا۔ بیشتر ارکان پارلیمنٹ ہنستے رہے اور میری اپنی پارٹی نے بھی توجہ نہ دی۔ انھیں گمان ہوا کہ کارگل آپریشن کے مضمرات کے بارے میں شاید میاں صاحب کو آگاہ کیا گیا تھا۔ اس کا اشارہ اعظم نواز شریف کی افراتفری کے عالم میں دوڑ کر امریکہ جانے اور صدر کلنٹن سے ہنگامی ملاقات کرنے سے بھی ملتا ہے۔ جس کے صدر کلنٹن کی مداخلت سے بھارت اور پاکستان میں نیوکلیائی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی۔

۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے حوالے سے جب فوج نے سول حکومت کے خلاف بغاوت کی، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت سے پس پردہ معاملات سے بے خبر رہے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں: اچانک ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی شام کو لاہور میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ اسلام آباد پر فوج نے قبضہ کر لیا ہے اور وزیر اعظم نواز شریف گرفتار ہو گئے ہیں۔ ہم نے ٹیلی ویژن پر بی بی سی لگایا تو پاکستانی فوج کے جوانوں کو پاکستان ٹیلی ویژن کے ہیڈ کوارٹر کے بند گیٹ پر چڑھ کر اندر کودتے ہوئے دیکھا۔ میں نے گھبراہٹ میں ایک صحافی دوست کو فون کرکے پوچھنا چاہا کہ کیا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، سننے میں یہی آیا ہے کہ دو تین جرنیلوں کی کاروائی ہے۔ ابھی اس پر کام ہو جائے گا اور وہ قابو کر لیے جائیں گے۔ مگر کوئی خاص کام نہ ہوا۔ تقریباً تین چار بجے رات کمانڈر انچیف جنرل پرویز مشرف نے ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کیا تو پتہ چلا کہ واقعی ملک پر فوج قابض ہو چکی ہے۔ پاکستان کا دستور معلق کر دیا گیا ہے، وزیر اعظم کو فارغ اور اسمبلیاں تحلیل ہو گئی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اطلاع ملی کہ وزیر اعظم نواز شریف، شہباز شریف وفاقی

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

وزرا اور انتظامیہ کے کچھ افراد گرفتار کے لیے گئے ہیں۔ اب ان پر مقدمات چلائے جائیں گے۔

بہر حال جاوید اقبال کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت سے پس پردہ حقائق سے لاعلم رہے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے یہ سب کچھ اچانک اور فوری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے لکھا ہے کہ ان تمام سوالوں کے جوابات میاں صاحب ہیں اپنی خود نوشت سوانح عمری میں دے سکتے ہیں۔

پرویز مشرف سے اپنی پہلی ملاقات کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھیں اسلام آباد سے فون آیا کہ وہ اسلام آباد پہنچ کر مشرف کے بلائے گئے اجلاس میں شرکت کریں۔ یہ اجلاس اس جنرل پرویز مشرف نے بھارت جا کر واجپائی سے بات چیت کرنے سے پہلے ریٹائرڈ جرنیلوں سابق وزرائے خارجہ بیوروکریٹوں اور دانشوروں کو بلایا تھا تاکہ ان سے رائے طلب کی جا سکے۔ اس میں سب نے اپنی رائے دی کہ بجا طور پر بھارت کے ساتھ اچھے تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اور بات چیت سے مسئلہ کو حل کرنا چاہیے۔

عدلیہ کی تحریک کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ مشرف نے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کو آرمی ہاوس بلا کر استعفی دینے کے لیے کہا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ ان کے خلاف سپریم جوڈیشل کونسل میں کیس لایا گیا لیکن فیصلہ افتخار چوہدری کے حق میں آیا۔ یہاں ڈاکٹر جاوید اقبال نے دو چیزوں کا خصوصی طور پر ذکر کیا ہے وہ یہ کہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج صاحبان نے عدلیہ کی آزادی کو برقرار رکھنے کی خاطر اتحاد کر لیا اور دوسری طرف پاکستان بھر کے وکلاء نے عدلیہ کی آزادی کے حق میں مسلسل احتجاج کیا۔ جس نے رفتہ رفتہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر دی۔ جس میں دوسرے پریشر گروپ سول سوسائٹی، ذرائع ابلاغ اور رائے عامہ شامل ہوتے چلے گئے۔ الغرض حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ نئے انتخابات سے مرکز میں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ ن کے اتحاد سے مخلوط حکومت وجود میں آئی اور پاکستان ایک بار پھر جمہوریت کی راہ پر گامزن ہوا۔ ۲۰۰۷ء کے پاکستان کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ یہ تبصرہ ذرا اس وقت کی حالت کو ایک نچوڑ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ۲۰۰۷ء کے وسط سے پاکستان اپنی تاریخ کے مشکل ترین دور میں داخل ہوا۔ ایک طرف تو وہ خود کش بمبار کی دہشت گردی کی لپیٹ میں تھا اور دوسری طرف سیاسی یا معاشی نوعیت کے تشدد میں جلاؤ گھیراؤ کی لہر سارے ملک میں پھیل گئی۔ عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے کہ حکومت مختلف انواع کی سازشوں کا گڑھ ہے۔ کئی طاقتیں امن عامہ کی تباہی کے بہانے جمہوریت کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے مگر یہ بھی ممکن ہے کہ دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ میں پاکستان کی شرکت امریکہ کے مخالف شدت پسند عناصر کو قبول نہیں لہذا وہ پاکستان کو سزا دے رہے ہیں۔ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی لاہور اسلام آباد راولپنڈی پشاور کوئٹہ وغیرہ میں خود کش بمباروں کے دھماکوں کے سبب سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ پاکستان افغانستان سرحد کے علاقوں مثلاً وزیرستان، سوات میں تو باقاعدہ خانہ جنگی کا شروع ہو گئی۔ ملک کے اندر لا اینڈ آرڈر کی صورتحال نہایت مخدوش ہے۔ امن پسند پاکستانی اپنے ملک کے اندر ہو یا باہر اپنے گھر کے اندر ہو یا باہر ہر جگہ غیر محفوظ ہے۔

آپ بیتی میں جسٹس جاوید اقبال نے اپنی ذاتی زندگی کے بہت سے گوشوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنی تاریخ پیدائش کے حوالے سے معلومات دیتے ہوئے بتایا ہے ان کی تاریخ پیدائش ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۴ء کی شب ۹ بج کر ۳۰ منٹ پر سیالکوٹ والے گھر میں ہوئی۔ یہ تفصیل اقبال نے اپنے دوست راجہ سریندر ناتھ کو ان کی جنم پتری بنوانے کے لیے دی تھی۔ لیکن ان کے ہوش سنبھالنے پر ان

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com
Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

کی یادداشت کا جو حصہ موجود ہے، وہ ۱۱۶ میکلوڈ روڈ والے گھر کا ہے۔ یہ کوٹھی جن دو یتیم بچوں کی تھی، اقبال نے ان کے ولی سے کرائے پر لے رکھی تھی۔

اپنی تعلیم کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ نو برس کی عمر میں سیکرٹ ہارٹ سکول سے فارغ کر دیا گیا کیوں کہ اس سے بڑی عمر کے لڑکے، لڑکیوں کے سکول میں نہیں رکھے جاتے تھے۔ انھیں ایک سال سینٹ فرانسس سکول انارکلی میں داخلہ لینا پڑا۔ وہاں ماسٹر تارا سنگھ ان کے استاد تھے۔ جو انھیں گھر پڑھانے کے لیے بھی آتے تھے۔

اپنے بچپن کے ایک شوق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انھیں مصوری کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے تصویر بنائی جو اچھی خاصی بن گئی۔ ان دنوں ان کے تایا بھی لاہور آئے ہوئے تھے اور ان کے گھر میں مقیم تھے۔ جب انھوں نے جاوید کی بنائی ہوئی یہ تصویر دیکھی تو فوراً ہاتھ میں لے کر ان کے والد کو دکھانے کے لیے چلے گئے۔ پہلے تو علامہ اقبال کو یقین ہی نہ آیا کہ یہ تصویر جاوید نے بنائی ہے۔ پھر انھوں نے اس خیال سے کہ ان کا دل لگا رہے۔ انھوں نے فرانس، اٹلی اور برطانیہ سے آرٹ کی کتابیں منگوا کر دیں تا کہ ان کا شوق بڑھ سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”جب میری نظر سے مصوری کے یہ شاہکار گزرے تو میں نے اس خیال سے ہمت ہار دی کہ اگر میں ساری عمر بھی کوشش کروں تو ایسی خوبصورت تصاویر نہیں بنا سکتا۔“ ۱۷

تحریک پاکستان کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو ان کی عمر ۱۶ سال تھی اس زمانے میں ان کے میٹرک کے امتحانات چل رہے تھے۔ اس لیے وہ اس جلسے میں شرکت نہ کر سکے لیکن قرارداد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مسلمان اس قرارداد کے منظور ہونے کی وجہ سے بڑے پرجوش تھے۔ اسی سلسلے میں ان کے دو اہم انگریزی مضامین ڈان اخبار میں شائع ہوئے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ غالباً ۱۹۴۶ء میں میرے دو اہم انگریزی مضمون ڈان اخبار میں شائع ہوئے۔ ایک کا عنوان قائد اعظم ایک عظیم انسان تھا۔ جس میں میں نے علامہ اقبال کے تصور مومن کی روشنی میں ثابت کیا تھا کہ کس طرح قائداعظم عام انسانوں سے بہتر ہیں۔ دوسرے مضمون اسلام اور پاکستان میں اُن کا مؤقف تھا کہ پاکستان کا تصور اسلام کسی روایتی فرقہ وارانہ تعبیر پر نہیں بلکہ اصلاحی تعبیر پر مبنی ہے۔ دونوں مضمون قائداعظم کی نظروں سے گزرے اور بقول ان کے سیکرٹری کے انھوں نے مضامین کو پسند فرمایا۔

شادی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کی اپنی ہونے والی بیوی سے پہلی ملاقات نیویارک میں ہوئی وہ بتاتے ہیں کہ ایک دوپہر لنچ بریک کے وقت وہ ڈیلیٹ سناون میں بیٹھے ہوئے تھے کہ راحت بخاری اور ڈاکٹر عبدالوحید اور کھڑے نظر آئے۔ چند لمحوں بعد ڈاکٹر عبدالوحید کی بیٹی ناصرہ تشریف لائیں۔ راحت بخاری نے ان کا تعارف مصنف سے کروایا۔ یہ ان کی اپنی بیوی سے ہونے والی سے پہلی ملاقات تھی۔ جون ۱۹۶۴ میں ان کا نکاح ہوا اور اکتوبر میں رخصتی ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے زیادہ تر توجہ وکالت پہ رکھی۔ آخر کار وہ نے مغربی پاکستان بار کونسل کی ممبر شپ کے لیے کھڑے ہوئے اور کامیابی حاصل کی۔

۱۹۷۸ء میں وفاقی حکومت نے جاوید منزل کو اقبال میوزیم بنانے کے لیے یہ جگہ ان سے قیمتاً خریدی۔ انھوں نے اس سے حاصل

ہونے والی رقم سے گلبرگ میں اراضی خرید کر گھر کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔یوں وہ وہ گلبرگ میں بننے والے نئے مکان میں منتقل ہو گئے جہاں وہ مرتے دم تک رہے۔ان کے دو بیٹے پیدا ہوئے ہوئے ایک کا نام ولید اقبال ہے اور دوسرے کا نام منیب اقبال ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک طرف جہاں اپنی ذاتی، خاندانی اور عملی زندگی کو بیان کرتے ہوئے کوئی لگی لپٹی نہیں رکھی، لیکن جو کچھ بیان کیا، وہ تہذیب کی حد میں رہ کر لکھا، بلکہ اکثر اپنے ذاتی زندگی کو بیان کرتے ہوئے، کچھ نہ کچھ پردہ اخفا ہی میں رکھا۔ ایسا باریک پردہ کہ پڑھنے والے ادھر دیکھ بھی سکیں اور نہیں بھی۔ مثلاً انھیں اپنی خاندانی زندگی بیان کرتے ہوئے کوئی بات لگی لپٹی نہیں رکھی اور نہ ہی جھوٹی روایات گھڑنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنے ددیال اور ننھیال کا ذکر کرتے ہوئے، یہ بات صاف صاف بتائی ہے کہ وہ کوئی بہت امیر لوگ نہیں تھے بلکہ وہ ایک عام سے گھرانے تھے

علامہ اقبال سے اختلافات اپنی جگہ موجود ہیں لیکن جہاں وہ فکر اقبال سے متفق ہیں اس کی تائید بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر جاوید اقبال کی صاف گوئی کی بدولت ان کی خودنوشت سوانح پر بہت زیادہ تنقید ہوئی۔دوسری وجہ ان کے اقبال کے ساتھ علمی اختلاف تھا جسے انھوں نے نہایت مودبانہ انداز میں بیان کیا تھا لیکن اقبال شناسوں کو ان کی یہ روش پسند نہیں آئی اور ان پر بہت زیادہ تنقید کی گئی۔اس حوالے سے ڈاکٹر خواجہ زکریا لکھتے ہیں:

"یہ خودنوشت سچائی اور خلوص سے لکھی گئی ہے لیکن بعض جگہ اس کا کھرا پن محدود دائروں میں مقید رہنے والے قارئین کو ناگوار گزرتا ہے، اس لیے اس کے خلاف متعدد لوگوں نے لکھا ہے جس میں خودنوشتوں پر بہت تفصیلی کام کرنے والے ڈاکٹر پرویز پروازی بھی شامل ہیں۔جاوید اقبال پر اکثر یہ تنقید کی جاتی ہے کہ علامہ اقبال کے توسط سے متعارف ہونے کی بجائے اپنے ذاتی خصائص کے حوالے سے پہچانے جانے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن یہ خواہش اس لیے قابل فہم ہے کہ انھوں نے زندگی میں بہت سے ایسے کام کیے ہیں جن کی اہمیت ان کی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر ہے۔بہت سے مشاہیر کی اولاد گمنام رہی لیکن جاوید اقبال کی بلندی درجات اور تصنیف و تالیف کا کام بجائے خود بہت اہم ہے۔اپنا گریباں چاک میں مصنف نے اپنی ذات کے بارے میں بہت کچھ سچ سچ لکھ دیا ہے۔جہاں انھیں اقبال کی فکر سے اختلاف ہے اس کی بھی مودبانہ انداز میں نشاں دہی کر دی ہے۔ملک کے سیاسی حالات پر بھی غیر جانبدرانہ انداز میں لکھا ہے۔"[۱۸]

اپنا گریباں چاک عام سوانح عمریوں سے مختلف سوانح عمری ہے کیوں کہ اس میں جگہ جگہ علامہ اقبال سے وابستہ افراد کا ذکر ملتا ہے۔یہاں وہ کش مکش کا شکار بھی ہوتے ہیں اور کئی جگہ اپنی الگ شناخت چاہتے ہیں۔دوسری طرف ان کی سوانح حیات محض ان کی زندگی کے واقعات کا بیان نہیں بلکہ ایک طرف فکر اقبال کی توضیحات ہیں تو دوسری طرف بیسویں صدی میں بنتے بگڑتے انسانی رویوں، تہذیب، معاشرت اور سیاست کی رجحانات کی عکاس ہے۔ڈاکٹر جاوید اقبال نے اس میں باوقار اور مضبوط عصاب کے ساتھ تمام باتوں کو لکھا ہے اور کہیں بھی دروغ گوئی اور بے جا قصیدے کہنے سے خود کو بچایا ہے ان کا یہ طرز عمل واقعی قابل داد ہے۔

☆☆☆☆☆

AL-AASAR Journal Vol. 3, No. 1 (2026)
Quarterly *Research Journal* Online ISSN: 3006-693X
www.al-aasar.com Print ISSN: 3006-6921

حوالے

۱۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند،(لاہور:پنجاب یونیورسٹی، جلد ششم،۲۰۱۴ء)، ص۱۷۵تا۱۷۶

۲۔ ایضاً،ص۱۷۵

۳۔ جاوید اقبال،ڈاکٹر،اپنا گریباں چاک،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۵ء)،ص ۲۲

۴۔ ایضاً،ص ۳۹

۵۔ ایضاً،ص ۱۲۔۱۳

۶۔ ایضاً،ص ۲۵

۷۔ ایضاً،ص۲۸

۸۔ ایضاً،ص۳۱

۹۔ ایضاً،ص۳۴

۱۰۔ ایضاً،ص۳۵

۱۱۔ ایضاً،ص۱۰۱

۱۲۔ ایضاً،ص۱۱۱

۱۳۔ ایضاً،ص۷۸

۱۴۔ ایضاً،ص۱۱۸

۱۵۔ ایضاً،ص۱۲۲

۱۶۔ ایضاً،ص۳۱

۱۷۔ ایضاً،ص۳۵

۱۸۔ ایضاً،ص۱۷۳

Bibliography

1- Khawaja Muhammad Zakria, Dr. Tarikh-e Adabiat-e Musalmanan-o Pakistan wa Hind, (Lahore: University of the Punjab, Vol.6, 2014), p175-176
2- ibid, p175
3- Javed Iqbal, Dr., Apna Greban Chak, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2015), p22
4- ibid, p39
5- ibid, p12-13
6- ibid, p25

AL-AASAR Journal
Quarterly Research Journal
www.al-aasar.com

Vol. 3, No. 1 (2026)
Online ISSN: 3006-693X
Print ISSN: 3006-6921

7- ibid, p28
8- ibid, p31
9- ibid, p34
10- ibid, p35
11- ibid, p101
12- ibid, p111
13- ibid, p78
14- ibid, p118
15- ibid, p122
16- ibid, p31
17- ibid, p35
18- ibid, 173